

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اشارات

کسی اہم کام کا سرانجام یا جانلا شبہ کافی حد تک اطمینان کا موجب ہوتا ہے۔ مگر جس انداز سے وہ کام تکمیل کے مختلف مراحل طے کرتا ہے اسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کیونکہ اس کے انداز تکمیل ہی سے اس کام کو سرانجام دینے والوں کی نیتوں، ان کے حقیقی عزائم اور ان کے رجحانات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ آپ اسلام کے بنیادی فریضہ نماز کو ہی لیجئے۔ ایک مسلمان جس انداز سے اس فرض کو انجام دیتا ہے اسے دیکھتے ہوئے اس حقیقت کا پتہ لگانا کچھ مشکل نہیں ہوتا کہ یہ شخص کس جذبہ اور احساس کے ساتھ اس فرض کو سرانجام دے رہا ہے۔ دلوں کا حال تو خدا ہی جانتا ہے مگر دلی کیفیات کی مخفی چنگاریاں اندرونی حرارت کا پتہ دے دیتی ہیں اور جو شخص بھی ان کے قریب ہوتا ہوا ان کی گرمی کو لازمی طور پر محسوس کرتا ہے گو وہ ان چنگاریوں کو دیکھ نہیں پاتا۔ خلوص دوسرے جذبات کی طرح ایک ایسا جذبہ ہے جو دوسرے انسانوں میں بڑھی سرعت کے ساتھ سرایت کرتا ہے اور اپنے وجود کو ان سے تسلیم کر دیتا ہے۔ کسی قوم کے رہنماؤں کا خلوص اور اس کی تلاح و بہبود کے لیے ان کا جذبہ صادق اور عزم راسخ سہانے خواب کی طرح لاشعور کے عالم میں کسی عارضی اور وقتی مسرت کا باعث نہیں بنتے بلکہ اس قوم کے دل و دماغ پر بڑے دور رس نتائج مرتب کرتے ہیں جن کی ضیا پاشیوں سے نہ صرف اس کے شعور کی لوح منور ہوتی ہے بلکہ زندگی کے سارے شعبے جگمگاتے ہیں۔

ہمارے ملک کے یہ مختلف حلقوں کی مفاہمت کے ساتھ دستور کا پاس ہو جانا حزب اقتدار اور حزب اختلاف دونوں کے لیے مزوہ جانفراہ ہے۔ اور اسے کامرانی کا ایک بہت بڑا مرحلہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ مگر جس انداز سے راہوار دستور منزل مقصود تک پہنچا ہے اور اسے راستے میں جو مختلف موانع پیش آئے ہیں اور انہیں دور کرنے کے لیے جو جتن کرنے پڑے ہیں انہیں دیکھتے ہوئے اس بات کا

بڑی آسانی سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ کسی نہایت ہی آمرانہ مزاج اور آمرانہ عزائم رکھنے والے آدمی کو بڑی مشکل کے ساتھ اس بات پر آمادہ کیا گیا ہے کہ وہ اس حقیقت کو پوری طرح نہ سہی مگر کسی نہ کسی حد تک تسلیم کرے کہ پاکستانی عوام بھڑوں کا گلہ نہیں چسے اقتدار کی لالچی جس طرف چاہے ہانک کر بے جاٹے بلکہ صاحب ارادہ اور صاحب شعور مخلوق کی ایک ایسی اجتماعی ہیئت ہے جو اپنے انسانی حقوق اور فرائض کا کچھ نہ کچھ احساس رکھتی ہے۔ اس حقیقت کو منوانے کے لیے حزب اختلاف کو بڑی تنگ و دو کرنا پڑی اور سر توڑ کوششوں کے بعد صدر صاحب اسے ماننے پر آمادہ ہوئے۔

جو لوگ حزب اختلاف کے ساتھ اس جدوجہد میں عملاً شریک رہے ہیں یا جنہوں نے اس جدوجہد کا ذرا گہرائی سے مطالعہ کیا ہے ان کے لیے اس بات کا سمجھنا کچھ مشکل نہیں کہ حزب اختلاف کو اس آزاد سرزمین میں تہہ پوں کے بنیادی حقوق کے تحفظ کے لیے بالکل اسی طرح ہاتھ پاؤں مارنے پڑے ہیں جس طرح کہ آزادی سے پہلے غیر ملکی آقاؤں کو یہ باور کرانے کے لیے جدوجہد کرنی پڑتی تھی کہ پاک و ہند کی سرزمین میں جو لوگ آباد ہیں وہ بہر حال انسان ہیں اور اس بنا پر وہ بعض ایسے حقوق رکھتے ہیں جنہیں غیر ملکی سامراج نکلنے کا کوئی حق نہیں رکھتا اور اگر وہ ایسا کر رہا ہے تو وہ انصاف اور انسانیت دونوں کا خون کر رہا ہے۔

آزادی کا سورج طلوع ہونے سے پیشتر انسانی حقوق پر غیر ملکی آقاؤں کی یلغار اور باشتگان ملک کی طرف سے ان کے تحفظ کے لیے بھرپور جنگ کوئی ایسی صورت حال نہ تھی جسے سمجھنا نہ جاسکتا ہو۔ غیر ملکی حکومت کا اپنی سامراجی فطرت کے تحت عوام کے حقوق پامال کرنا خلاف توقع نہ تھا کیونکہ ان حقوق کو پامال کر کے ہی وہ اپنے ناپاک عزائم کی تکمیل کر سکتی تھی دوسری طرف اہل ملک کو بھی اس بات کا پوری طرح احساس تھا کہ جو قوم ساتھ سمندر پار کر کے بالبحیر اس کی سرزمین پر قابض ہوئی ہے وہ فرشتہ رحمت بن کر تو نہیں آئی بلکہ دیوا استبداد بن کر نازل ہوئی ہے۔ اور اس کا مدعا ظلم و استحصال ہے۔ وہ جتنی دیر یہاں مسلط رہے گی اس عمل کو جاری رکھے گی۔

آزادی کے بعد حاکم و محکوم کے درمیان اس باہمی آدریش کو از خود ختم ہو جانا چاہیے تھا اور ملک کے حکمرانوں کو یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر کے اقتدار کی سند پر منمنکن ہونا چاہیے تھا کہ وہ کسی دوسری قوم کی

گردن پر مسلط نہیں ہیں بلکہ خود ان کی اپنی قوم نے امورِ مملکت چلانے کا کام بطور امانت اُن کے سپرد کر رکھا ہے اس لیے اُنہیں اپنی ساری صلاحیتیں قوم کی فلاح و بہبود کے لیے صرف کرنی چاہئیں، اور جان بوجھ کر کوئی ایسا کام نہ کرنا چاہیے جس سے قوم کے کسی طبقے میں بھی یہ احساس پیدا ہو کہ حکمران امانت میں خیانت کا ارتکاب کر رہے ہیں۔

پھر حکمران طبقے کو یہ بات بھی ہر وقت اپنے پیش نظر رکھنی چاہیے تھی اور اب بھی رکھنی چاہیے کہ اقتدار کسی فرد یا گروہ کا پیدا نشی یا موردِ وثیقت نہیں جس سے وہ کبھی محروم نہیں کیا جاسکتا۔ جمہوریت کے اندر اقتدار بالکل آئی جانی شے ہے۔ آج اگر یہ ایک گروہ اور طبقے کے ہاتھ میں ہے تو کل دوسرے گروہ اور طبقے کے ہاتھ میں آسکتا ہے۔ کسی جمہوری ملک میں اچھے حکمران وہی لوگ ثابت ہوتے ہیں جو نشہٴ اقتدار میں بدست نہیں ہوتے اور ہوش و خرد سے دستبرداری کا اعلان نہیں کرتے بلکہ اقتدار کی مسند پر بیٹھ کر اس حقیقت کو ہمیشہ نگاہ میں رکھتے ہیں کہ اُنہیں کل اس مسند کو چھوڑ کر عوام کی صفوں میں واپس جانا ہوگا۔ اس لیے اُنہیں کوئی ایسا کام نہ کرنا چاہیے جس سے وہ مسندِ اقتدار چھین جانے کے بعد عوام سے آنکھیں نہ ملا سکیں بلکہ اُنہیں عہدِ اقتدار میں بھلائی کے ایسے کام کرنے چاہئیں کہ کل جب وہ اقتدار سے محروم ہو کر عوام کے سامنے آئیں تو اُنہیں اُن کی نظر میں عزت و احترام کا ایک ایسا بلند مقام حاصل ہو جو دورِ اقتدار میں بھی اُنہیں حاصل نہ تھا۔ مسندِ اقتدار کے ساتھ اس نوعیت کی وابستگی کوئی ایسی چیز نہیں جسے محض خیالی کہہ کر نظر انداز کر دیا جائے۔ جن ممالک میں بھی نظامِ مملکت جمہوری اصولوں اور جمہوری روایات کے مطابق چلایا جاتا ہے وہاں اقتدار کو کوئی ذاتی جاگیر سمجھ کر اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کی جاتی بلکہ تختِ اقتدار پر متمکن ہونے والے افراد اس حقیقت کو نگاہ میں رکھ کر ملک کی زمام کار سنبھالتے ہیں کہ اُنہیں قوم نے بعض مندرجہ ذیل کی تکمیل اور اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کے لیے اقتدار کی قوت فراہم کی ہے اس لیے اُنہیں اس قوت سے پوری طرح فائدہ اٹھانے کی کوشش کرنی چاہیے تاکہ عوام میں اُنہیں مقبولیت حاصل ہو اور وہ ایوانِ اقتدار کے اندر اور باہر دونوں جگہوں پر یکساں احترام کی نگاہ سے دیکھے جائیں۔

اقتدار کے بارے میں سیدنا ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ایک ایسا قول مشہور ہے جو پوری تاریخِ حکمرانی کا تابناک عنوان بن سکتا ہے۔ حضورِ سرورِ دو عالم کے اس فدائی سے کسی صحابی نے ایک مرتبہ سوال کیا کہ حکمران کس قسم کا ہونا چاہیے تو اس عارفِ ربانی نے برہنہ کہا کہ حکمران ایسا ہونا چاہیے کہ وہ جب مسندِ اقتدار پر فائز ہو تو عوام اسے اپنے میں سے ایک فرد سمجھیں اور وہ جب مسندِ اقتدار سے ہٹ جائے تو وہ معاشرے میں اس طرح نمایاں

ہو گیا کہ وہ صاحبِ اقتدار ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ اس کی عزت و توقیر اس مسند کی رہیں منت نہ ہو جس پر وہ قابض ہے، بلکہ اس کے ذاتی اوصاف اور اچھے اخلاق کی وجہ سے عوام اسے سر آنکھوں پر بٹھانے کے لیے تیار ہوں۔ جو لوگ مسندِ اقتدار کو عوام میں اپنی مقبولیت قائم کرنے کا ذریعہ سمجھتے ہیں وہ ہمیشہ خود فریبی کا شکار رہتے ہیں کیونکہ جو نہیں وہ اس مسند سے ہٹتے ہیں بلکہ جس وقت ان کے اقتدار کا سنگھاسن ڈولتا نظر آتا ہے تو لوگ ان سے آنکھیں پھیر لیتے ہیں۔ جب واجب الاحترام مسندِ اقتدار ہے نہ کہ وہ فرد جو اس پر براجمان تو لوگوں کو اس بات کی آخر کیا ضرورت پڑی ہے کہ وہ مسند کے بجائے فرد سے اپنے آپ کو وابستہ رکھیں بلکہ یہ کہ فرد ایک ایسی قابلِ قدر شخصیت ہو کہ جس کی وجہ سے مسند کی رونق اور عزت میں اضافہ ہو اور جس کے مسند سے الگ ہو جانے کے بعد اس کا وقار گر جانے کا اندیشہ ہو۔

اسے ہماری بد قسمتی کے علاوہ اور کیا کہا جاسکتا ہے کہ تاریخ نے نوعِ انسانی کو حکمرانی کے بارے میں جو تفسیر دیا ہے اُسے ہمیشہ بھلانے کی کوشش کی گئی ہے اور اپنی ذاتی خوبیوں کو اپنی مقبولیت کا ذریعہ بنانے کے بجائے تختِ اقتدار کو اپنی سر بلندی کا زینہ بنانے کی سعی کی ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم جو اور طالع آزمایا افراد سازہ شوں، دھوکے بازیوں، جھوٹے وعدوں، عوام کے جذبات سے کھیل کر اور اسی نوعیت کی دوسری اخلاق سوز حرکتوں کے ذریعے تختِ اقتدار پر مسلط ہو جاتے ہیں اور دیکھتے دیکھتے فخر ایشیا، عمر ثانی اور قوم کے نجات دہندہ کہلانے لگتے ہیں۔ ان کے مصاحبین اور حکومت کے نشر و اشاعت کے وسیع ذرائع ان کی برتری اور عظمت کا اس طرح پراپیگنڈا کرتے ہیں گویا کہ ان کے علاوہ دنیا میں کوئی دوسری قابلِ احترام شخصیت موجود نہیں اور وہ صرف اپنے ملک اور قوم کے ہی قابلِ فخر نجات دہندہ نہیں بلکہ پوری نوعِ بشری کے نجات دہندہ ہیں۔ چشمِ فلک نے آج تک ان جیسا عادل، ایثار پیشہ اور مدبر صاحبِ اقتدار کوئی دوسرا نہیں دیکھا مگر جو نہیں تختِ اقتدار ان سے چھتا ہے وہ ان صفات میں سے کسی ایک صفت کے بھی حامل نہیں رہتے بلکہ ان کے برعکس عیوب کا مجموعہ بن جاتے ہیں۔ اس کی وجہ بجز اس کے اور کیا ہے کہ ہماری قوم کے ان افراد نے جنہیں حکمرانی کا شوق ہے انہوں نے ابھی تک اس حقیقت کو نہیں سمجھا کہ اقتدار کے ذریعے حاصل کردہ جاہ و جلال کی حیثیت ملمع سازی کی سی ہوتی ہے۔ جب ملمع اترتا ہے تو باقی مس خام رہ جاتا ہے جو کسی قدر کا مستحق نہیں ہوتا۔

اقتدار کے بارے میں ہماری دوسری بدقسمتی یہ ہے کہ ہمارے اکثر و بیشتر حکمرانوں نے اس عظیم فرق کو ابھی تک نہیں سمجھا جو اپنی قوم کے سربراہوں اور غیر ملکی حکمرانوں کے نقطہ نظر میں پایا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں جو بھی مسند اقتدار پر آیا ہے اس نے کبھی یہ سوچنے کی زحمت ہی گوارا نہیں کی کہ وہ اسی قوم کا ایک فرد ہے جس نے اُسے زمام کار سونپی ہے اس بنا پر وہ اپنے دور حکمرانی میں جو اچھے بُرے کام بھی کرے گا اس کے اثرات اس کی ذات اور اس کے مستقبل پر مرتب ہوں گے اگر وہ خیر اور بھلائی کے کام کرے گا، معاشرے میں عدل و انصاف کے قیام کے لیے اور ظلم اور نا انصافی کو مٹانے کے لیے وہ جو موثر قدم بھی اٹھائے گا تو اس سے اگر ایک طرف اُسے شہرت اور ناموری حاصل ہوگی تو دوسری طرف معاشرے کے ایک رکن کی حیثیت سے خود اس کی ذات اور اس کی اولاد اور اس کے خاندان اور اس کی قوم کو فائدہ پہنچے گا اور اس کے مقابلے میں وہ بُرائی کے جتنے کام کرے گا، اپنے عہد حکمرانی میں ظلم و استبداد کی جتنی ناپسندیدہ اور اخلاق سوز روایات چھوڑے گا ان کا عذاب اُس پر اور اس کے خاندان پر بھی مسلط ہوگا اور کسی صورت میں بھی ان سے بچ نہ سکے گا۔ خدا کی یہ سنت ہے کہ جب ایک فرد یا گروہ برائی کے ارتکاب پر مصر ہوتا ہے تو خالق نہ صرف اس کی فطرت کو مسخ کرتا ہے بلکہ اُسے بصیرت سے بھی محروم کر دیتا ہے اور وہ دور کے حالات و واقعات سے تو کیا اپنی آنکھوں کے سامنے ہونے والے حادثات سے بھی کوئی عبرت نہیں پکڑتا۔ اُس کی نگاہیں صبح و شام بلکہ ہر آن ظالموں کے انجام کو دیکھتی ہیں۔ مگر اسے جب بھی ظلم کرنے کی قوت اور موقع فراہم ہوتا ہے تو وہ فوراً اس کے نتائج سے بے پروا ہو کر اس کا ارتکاب کرنے لگتا ہے اور اس غلط فہمی میں مبتلا رہتا ہے کہ اس کا انجام دوسرے ظالموں کے انجام سے بہر طور مختلف ہوگا اور اس کی ذات ظلم کے خوفناک انجام سے ہر طرح محفوظ و مامون رہے گی۔

ہماری قوم کو حال ہی میں جو دستور ملا ہے اس میں اقتدار کے چٹور پن اور اُسے ناجائز مفادات کے حصول کا موثر ذریعہ سمجھنے کی وجہ سے جو غلط رجحانات کسی صاحب اقتدار کے اندر پیدا ہو سکتے ہیں ان کی جھلک دستور میں باذنی تامل دیکھی جاسکتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ الفاظ کی حد تک عوام کو چند حقوق دیے گئے ہیں مگر ان حقوق کی نوعیت بددلی سے دی ہوئی ان مراعات (UNGRUDGING CONCESSIONS) کی سی ہے جو ایک آمر مطلق عوام کے اصرار اور دباؤ کی وجہ سے انہیں بخش

دینے پر مجبور ہوتا ہے ورنہ دستور کی ایک ایک شق سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ سارے اختیارات کا مرکز و محور تنہا وزیر اعظم کی ذات ہے۔ اور یہ ذراتِ عظمیٰ صرف ایک شخص کے لیے مختص ہے اس بنا پر اگر اس شخص نے اپنے لامحدود اختیارات پر کوئی پابندی عائد کی ہے تو یہ اُس نے اپنی ذات پر زیادتی کرتے ہوئے قوم پر احسانِ عظیم کیا ہے، ورنہ حقیقت میں اقتدار اسی کے ہاتھ میں مرتکب نہ رہنا چاہیے اور کسی دوسرے فرد یا گروہ کو اس ارتکاز پر کوئی اعتراض نہ کرنا چاہیے بلکہ خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ قوم کے ایک مخلص بندے نے اختیارات کا سارا بوجھ تنہا اپنی کمر پر لاد لیا ہے اور ساری قوم کو اس مصیبت سے نجات دلائی ہے۔

اس قسم کا دستور جو صرف ایک شخص کے اختیارات کو تحفظ دینے کے لیے اور زندگی کے سارے شعبوں پر اس کی بالادستی قائم کرنے کے لیے تیار کیا گیا ہو اس کا حشر اور خود اس شخص کا حشر جس کی خوشنودی کی خاطر یہ سب دھاندلیاں کی جاتی ہیں اسی نوعیت کے آمرانہ و سائبر اور آمرانہ مزاج رکھنے والے اصحابِ اقتدار سے کسی طرح مختلف نہیں ہو سکتا۔ بھلائی ہی بھلائی کو جنم دیتی ہے اور بُرائی کے بطن سے بُرائی ہی نمودار ہوتی ہے خدا کا اپنی مخلوق پر یہ بھی ایک بہت بڑا احسان ہے کہ اس نے خیر اور بھلائی کو دوام بخشا ہے۔ مگر فساد اور بُرائی کے اندر ایسے ڈاٹنا ماسٹ بچھا دیے ہیں کہ اگر باہر سے اُسے مٹانے کی کوئی صورت پیدا نہ ہو رہی ہو تو اس کے اندر سے اس کی تباہی کا سامان ہو جائے۔ کسی انسان کا غیر مسؤل اقتدار بھی ایسی بُرائی ہے جسے مٹانے کا خود قدرت نے انتظام کیا ہے کیونکہ اسی سے انسان پر انسان کی خدائی قائم ہوتی ہے رحمتِ باری آخر اس اندوہناک صورت حال کو کس طرح گوارا کر سکتی ہے کہ اُس ذریعہ کو پائیداری عطا کرے جس سے انسان پر انسان کی کبریائی قائم ہونے کا راستہ ہموار ہوتا ہے۔ چنانچہ قادرِ مطلق نے اسے تباہ کرنے کا یوں انتظام کیا ہے کہ جو شخص بھی غیر محدود اختیارات کا جس قدر حریص ہوتا ہے اسی نسبت سے وہ ایسے ظالمانہ جھکندے استعمال کرتا ہے جس سے اس کی شہرت کو نقصان پہنچتا ہے اور عوام میں اس کی ساکھ گرنے لگتی ہے۔ اپنی اس گرتی ہوئی ساکھ کو سنبھال دینے کے لیے وہ اپنے ارد گرد ایسے لوگ جمع کرتا ہے جو اسے باور کراتے رہتے ہیں کہ حضور کا اقبال بڑی تیزی سے ترسی کر رہا ہے، حضور کی عزت و شہرت کا ستارہ اوجِ ثریا پر ہے، حضور کے کرداروں پر ستارہ حضور کی خاطر اپنی جائیں نثار کرنے کے لیے تیار کھڑے ہیں۔ بس حضور کے اشارہ اور وحیم کے منتظر ہیں۔ اقتدار کے ایوانوں کی خواہ وہ ماضی کے ہوں یا حال کے ہمیشہ سے بیرینت رہی ہے کہ اگر یہ جوصلہ مند مند تہ

مصنف مزاج اور خدا ترس لوگوں سے آباد ہوں تو پھر خوشامدیوں کو ان کے اندر راہ پانے کے کوئی زیادہ مواقع فراہم نہیں ہوتے بلکہ ان کے اندر ان لوگوں کی پذیرائی ہوتی ہے جو حق بات کہنے کی جرأت اور حوصلہ رکھتے ہوں مگر جب یہ ایوان ظالموں اور فساق و فجار سے بھر جاتے ہیں اور عوام ان کے ظلم و ستم کے خلاف دہائی دینے لگتے ہیں تو پھر یہ سفاک حکمراں اپنے ضمیر کی آواز کو دبانے کے لیے قصیدہ خوانوں کی فوج بلا لیتے ہیں تاکہ وہ ان کی ثنا خوانی میں مصروف ہو جائیں۔ اس طرح بگڑے ہوئے حکمراں اپنے آپ کو فریب دینے کا سامان کرتے رہتے ہیں مگر اس سے زندگی کے تلخ حقائق تو نہیں بدلتے اور نہ بگڑے ہوئے حالات کسی لحاظ سے بھی درست ہو سکتے ہیں اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پورے ملک میں خوفناک بگاڑ پیدا ہو جاتا ہے مگر عقل کے یہ اندھے اصلاح احوال کے بجائے اپنے اقتدار کے تحفظ کی فکر کرتے ہیں اور اس مقصد کے لیے نہایت گھٹیا سے گھٹیا حربے استعمال کرتے ہیں۔ عوام کی زبانوں پر پھرے بھٹائے جاتے ہیں، ان پر مختلف طریقوں سے عرصہ حیات تنگ کیا جاتا ہے، معاشرے کے ضمیر فروش افراد کو تلاش کر کے انہیں اپنے ساتھ ملایا جاتا ہے، پولیس، فوج اور نوکر شاہی کو اپنے اصل فرائض سے ہٹا کر ایک شخص کے اقتدار کو تحفظ دینے پر مامور کر دیا جاتا ہے۔ جس کا انجام یہ ہوتا ہے کہ حالات مزید بگڑنے لگتے ہیں۔ صاحب اقتدار اپنے اقتدار کو طول دینے کے لیے جس قدر زیادہ ظلم کرتا ہے اسی قدر وہ عوام کی نظروں میں گرتا چلا جاتا ہے۔ اس کا مداوا وہ کوئی تعمیری قدم اٹھا کر نہیں کرتا بلکہ عوام پر دستِ ظلم دراز کر کے اور ظالموں کی تائید حاصل کر کے کرتا ہے۔

یہ بے ضمیر، خوشامدی اور ظلم و استبداد کی حمایت کرنے والے افراد صاحب اقتدار کی آنکھ کا تارا بن کر ناجائز مراعات حاصل کرنے کی غرض سے ہمیشہ اُسے غلط راہ پر ڈالتے رہتے ہیں۔ تاکہ وہ کوئی صحیح قدم اٹھا کر عوام کے اندر مقبولیت حاصل نہ کرے اور اس طرح ان کی تائید سے بے نیاز نہ ہو جائے۔

یہ صورت حال اقتصادی بحران کی طرح ایک شیطانی چکر ہے جس سے نکلنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ حصہ اقتدار غیر مسئول اختیارات کے حصول کی خواہش پیدا کرتی ہے۔ اس خواہش کی وجہ سے انسان کے اندر دوسروں کے حقوق پر ڈاکہ ڈالنے اور اپنے آپ کو خدا بنانے کا ناپاک جذبہ ابھرتا ہے۔ جس کی بنا پر انسان

(باقی صفحہ ۱۰۵ پر)